

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اشارات

موجودہ حکومت جمہوریت کے سارے بلند بانگ دعوؤں کے باوجود اس راہ پر گامزن ہے جسے کسی صورت بھی جمہوریت کی راہ نہیں کہا جاسکتا بلکہ صحیح طور پر فسطائیت کی راہ کہا جاسکتا ہے۔ حکومت کا مزاج اس کا طرز عمل قومی مسائل کو طے کرنے کے طریقے، عوام کے جذبات میں اشتعال پیدا کرنے کے مختلف حربے یہ سب اس بات کی دہاتی دے رہے ہیں کہ حکومت نخل جمہوریت کو بار آور رہونے کا موقع نہیں دینا چاہتی بلکہ فسطائیت کو پروان چڑھانے کا عزم رکھتی ہے۔

آقدار کے آمرانہ مزاج کی شہادت میں یون تو کئی ایک مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں لیکن اس نے جو ظالمانہ سلوک ماہنامہ اردو ڈائجسٹ ہفت روزہ زندگی اور ہفت روزہ پنجاب پنج کے مدیروں اور دانشوروں سے کیا ہے اُسے دیکھتے ہوئے اس کی جمہوریت پسندی کا سارا پول کھل جاتا ہے۔ یہ بات بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ جس انصافی اور فسطائی ذہنیت کا مظاہرہ ان جرائد کے بارے میں کیا گیا ہے اس کی مثال تو انگریزی حکومت کے پورے دور استبداد میں بھی نہیں ملتی۔ غیر ملکی سامراج پرپس سے ہمیشہ خوفزدہ رہا اور اس نے اس کی آواز کو غیر مؤثر بنانے بلکہ دبانے کے لیے بڑے عجیب و غریب ہتھکنڈے استعمال کیے مگر جس تعدی اور لاقانونیت سے ان پرچوں کا کلا گھونٹا گیا ہے اسے نرم سے نرم الفاظ میں بھی انسانیت سوز کہا جاسکتا ہے۔

کون نہیں جانتا کہ انسانی حقوق کے واضح احساس اور شعور سے جمہوریت جنم لیتی ہے، تقریر و تحریر کی آزادی اور اجتماع کی آزادی سے یہ پروان چڑھتی ہے اختلاف رائے کو ٹھنڈے دل سے سننے اور خندہ پیشانی سے اُسے برداشت کرنے اور اس کے مقابلے میں دلیل کے ساتھ اپنا موقف بیان کرنے اور ناقد کو اس کی غلطی واضح کرنے سے اس میں ذہنی اور اخلاقی نچنگلی پیدا ہوتی ہے۔ کسی جمہوری معاشرے کو حکومت کبھی بھی اس بات کا پابند

نہیں کرتی کہ اگر کوئی زبان کھولے تو صرف سرکارِ عالی مدار کی تعریف و توصیف میں کھولے ورنہ بند رہے یاٹے کی آزادی ایک انسان کا فطری حق ہے جسے جمہوری معاشرہ کبھی بھی سلب نہیں کرتا۔ باقی یہاں یہ مسئلہ کہ اگر کوئی فرد یا گروہ آزادی رائے کی آڑ میں ملک کے اندر انتشار پھیلا رہا ہے تو اسے اس مذموم کام سے باز رکھنے کے لیے عدالت کی طرف رجوع کیا جاتا ہے اس کے لیے مارشل لا کا سہارا نہیں لیا جاتا جبار سے اس ملک میں اخبارات اور جرائد کو اپنی جانزحدود سے آشنا کرنے اور انہیں ان کا پابند بنانے کے لیے پریس لاز کی صورت میں قوانین موجود ہیں ان کے سوتے ہوتے مارشل لا کے تحت کارروائی اس بات کا تین ثبوت ہے کہ حکومت کو اس بات کا اچھی طرح اندازہ ہے کہ اس کا موقف اخلاقی اور قانونی اعتبار سے کمزور ہے اور اسی وجہ سے وہ مارشل لا کے ذریعے اپنے خیال میں ناخوشگوار آوازوں کو خاموش کرنا چاہتی ہے اگر اس کا اخلاقی موقف مضبوط ہوتا تو وہ نشر و اشاعت کے نہایت وسیع ذرائع جن کی وہ تنہا مالک ہے، سے کام لیکر ان ناقدین کی غلطیوں کو عوام کے سامنے لاتی اور انہیں یہ بتاتی کہ یہ لوگ کس طرح کی بودی باتیں کرتے ہیں اور اگر حکومت قانونی نقطہ نظر سے اپنے موقف کو مضبوط پاتی تو عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاتی اور ان حضرات سے انہیں سزا دلواتی جہاں ملک میں عدل و انصاف کی حکمرانی قائم کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ اگر قاتل ہی شاید اور منصفیت بن جائیں تو پھر انصاف کا خون ناگزیر ہے کیونکہ قاتل خود نہ تو اپنے خلاف شہادت دے سکتا ہے اور نہ اپنے آپ کو مجرم قرار دے کر سزا دینے پر آمادہ ہو سکتا ہے موجودہ حکومت میں اگر کوئی فرد بھی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اقتدار کے نشہ نے اس کی فکری صلاحیتوں کو بالکل منسوج نہیں کر دیا تو اسے اپنے اس ظالمانہ طرزِ عمل کے دور رس نتائج پر تنبیہ کی سے غور کرنا چاہیے اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ کیا اس قسم کے آمرانہ ہتھکنڈوں سے کسی آواز کو مستقل طور پر دیا جاسکتا ہے اگر یہ بات کسی طرح ممکن ہوتی تو فرود کی خدائی کو کبھی زوال نہ آتا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جس رفتار سے اختلافات کی ناخوشگوار آوازوں کو دبائے کی کوشش کی جاتی ہے اسی رفتار سے ان میں شدت پیدا ہو جاتی ہے اور بالآخر ان آوازوں کی خوفناک چیخوں سے حکومت کے ایوان لرزنے لگتے ہیں اور جلد ہی پیوندِ خاک ہو جاتے ہیں۔ اس بنا پر حکومت کو یہ آمرانہ اندازِ فکر ترک کر کے معقول طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے کیونکہ اسی میں اس کی بھلائی ہے۔ کاش ہمارے حکمران تاریخ سے سبق حاصل کریں اور ان خوشامدیوں کے مشوروں سے بچیں جنہوں نے ہر دور میں ذاتی مفادات کی خاطر اصحابِ اقتدار کو گمراہ کر کے نہیں عبرتناک انجام دے دیا کیا۔

خداوند کی جس فضا میں قومی اسمبلی کا اجلاس بلا یا گیا اور جس مجلس میں ایک عبوری آئین منظور کر کے اسے نافذ کیا گیا اسے دیکھتے ہوئے عام تاثر یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس ضمن میں بھلائی کا جو کام بھی ہوا تھا وہ خوشدلی کے ساتھ نہیں ہوا بلکہ سخت مجبوری کے ساتھ کرنا پڑا ہے۔ یہ بات بلاشبہ موجب اطمینان ہے کہ مارشل لا کی تاریک رات کا خاتمہ ہوتا ہے مگر جس صبح آزادی کا فردہ ہمیں سنا یا گیا تھا وہ ابھی طلوع ہوتی نظر نہیں آتی بلکہ صبح کا ذب کی چند دھندلی لکیروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہمیں یہ تسلی دی جا رہی ہے کہ یہی وہ صبح ہے جس کے تم اتنی دیر سے منتظر تھے۔ حکومت کے حاشیہ نشین اس آئین کی مدح و ستائش میں جو چاہیں کہتے رہیں مگر وہ اکٹھے جو صبح صادق کی نشانیوں کو پہچاننے کی قدرت رکھتی ہے اسے کسی صورت بھی دھوکا نہیں دیا جاسکتا کیونکہ اسے اچھی طرح علم ہوتا ہے کہ یہ صبح آزادی کی وہ سفیدی نہیں جو رات کے اندھیروں پر غالب آکر پوری فضا میں نور کے لطیف ریزے بکھیر کر اسے لہجہ نور بنا دیتی ہے۔ یہ صبح کا ذب کی سفیدی ہے جس سے سطح میں آنکھیں نو دھوکا کھا کر اسے طلوع صبح کی بشارت سمجھ سکتی ہیں مگر دیدہ بنیائے بات پوشیدہ نہیں کہ اس صبح کا ذب کے پس پردہ رات کو اپنے تاریک سائے پھیلانے کا موفح میسر آ رہا ہے۔ دستور کے بارے میں برسرِ اقتدار طبقے کے آمرانہ عزائم کو جاننے کے لیے کسی لمبی چوڑی قانونی جہارت کی ضرورت نہیں بلکہ ایک عام شہری کی حیثیت سے بھی اگر اس پر ایک اچھٹی ہوئی نگاہ ڈالی جائے تو اس کے اسلامی اور جمہوری مزاج کی حقیقت خود بخود واضح ہو جاتی ہے۔ ہم یہاں اس کے چند نکات بطور مثال پیش کرتے ہیں

برسرِ اقتدار پارٹی جن نعروں کو لے کر اٹھی تھی اس میں دو نعرے یہ تھے کہ ”اسلام ہمارا مذہب ہے“ اور ”جمہوریت ہماری سیاست ہے“ مگر اس دستور کی تدوین میں ان نعروں کو جس انداز سے پس پشت ڈالا گیا ہے اس پتہ چلتا ہے کہ یہ درحقیقت سادہ لوح عوام کو دھوکا دینے کے لیے محض نعرے ہی تھے، ان کے پیچھے کوئی خلوص اور عزم صادق کارفرمانہ تھا اس لیے انہیں ترتیب دستور کے مرحلے میں نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ دستور میں قرار داد مقاصد شامل کر کے یہ تاثر تو بلاشبہ دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس ملک میں حاکمیت صرف خداوند تعالیٰ کی ہے اور جن لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار کی باگیں ہیں وہ ایک محدود پیمانے پر اس حاکمیت کے امین ہیں اس لیے وہ مطلق العنان اصحابِ اقتدار نہیں بلکہ اس زمین میں خلق کے بارے میں خدا کے منشا کو پورا کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ اسلام نے مسلمان حکمران اور اسلامی ریاست پر جو ذمہ داریاں ڈالی

ہیں وہ صرف اسی حد تک محدود نہیں کہ فلاں فلاں کام جو مشائے الہی کے خلاف ہیں ان سے باز رہنے اور عوام کو باز رکھنے کی کوشش کی جائے۔ ان ذمہ داریوں کا دائرہ ان سے کہیں زیادہ وسیع ہے! اسلام منکرات سے بچنے کے ساتھ ساتھ مسلمان حکمرانوں اور مسلم معاشرے کو اس بات کا پابند بھی کرتا ہے کہ وہ "معروف" کو پوری قوت کے ساتھ نافذ کرے۔ قرآن کریم میں اس حقیقت کو واضح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا
الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَآمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ
وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (الحج: ۴۰)

یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو
وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، معروف کا حکم
دیں گے اور منکر سے منع کریں گے۔

آپ پورے دستور کا مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ "معروف" کے بارے میں ایک اسلامی ریاست پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں انہیں کس حد تک تسلیم کیا گیا ہے اور ان ذمہ داریوں سے عہدہ براہونے کے لیے کس عزم کا اظہار کیا گیا ہے اس نقطہ نظر سے اگر اس کا جائزہ لیا جائے تو یہ دستور بڑا مایوس کن ہے۔ اس میں نہ تو نظام صلوٰۃ کے قیام کا کوئی تذکرہ ہے اور نہ نظام زکوٰۃ کے نفاذ کا کوئی منصوبہ اور نہ معروف کو ملک میں پھیلانے کی کوئی ضمانت۔ اسلام کے تقاضے قرار داد مقاصد کی اس ترقی کہ اسلام نے جمہوریت، آزادی، مساوات اور رواداری کے جو تصورات پیش کیے ہیں انہیں بروئے کار لانے کی کوشش کی جاوے گی سے تو پورے نہیں ہوتے۔ ان تصورات کو تو دوسری قومیں بھی کسی نہ کسی صورت میں اپنا رہی ہیں اسلامی ریاست صرف ان تصورات کی وجہ سے دوسری ریاستوں سے ممتاز نہیں بلکہ اس کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی حدود میں بسنے والوں کو ان اوصاف سے منصف کرنے کی کوشش کرتی ہے جن کی بنا پر وہ دنیا اور آخرت میں خداوند تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کر سکیں۔

جہاں تک اسلامی معاشرے سے منکرات کے استیصال کا تعلق ہے اس کا تذکرہ بھی دستور میں بڑے نیم دلانہ انداز سے کیا گیا ہے اور ان برائیوں کو بیخ و بن سے اکھاڑنے کے لیے اسلام جس سختی سے تاکید کرتا ہے اس کا کوئی ادنیٰ اشارہ بھی نہیں دستور میں نہیں ملتا شراب، جوئے، تجرہ گری اور اسی نوعیت کی دیگر برائیوں نے ہمیں جو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے ان سے اس ملک کا بچہ بچہ واقف ہے۔ معدودے چند

افراد کو چھوڑ کر ملک کی پوری آبادی ان کا قلع قمع چاہتی ہے اور حکومت سے بار بار اس بات کا مطالبہ کر رہی ہے کہ وہ کسی طرح مسلم معاشرے کو ان بُرائیوں سے پاک کرے۔ اگر حکومت کے دل میں اپنی اسلامی ذمہ داریوں کا کچھ بھی احساس ہوتا اور اسے عوامی جذبات کی کچھ بھی قدر ہوتی تو وہ دستور میں بڑے واضح الفاظ میں ان کے استیصال کا ذکر کرتی لیکن دستور میں جس انداز سے ان بُرائیوں کی "حوصلہ شکنی" پر اکتفا کیا گیا ہے اسے دیکھتے ہوئے یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں کہ حکومت بڑے جبر واکراہ کے ساتھ ان بُرائیوں کے بارے میں "حوصلہ شکنی" کا رویہ اختیار کر رہی ہے۔ ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ آخر انہیں کیسے ممنوع قرار دینے میں کوئی چیز مانع ہے۔

جوئے اور قحبہ گرنی کی تباہ کاریوں کے متعلق تو ان افراد اور ان قوموں کو بھی کوئی اختلاف نہیں جو ان بُرائیوں میں عورت ہیں۔ باقی رہی شراب تو اس کے بارے میں بھی اطباء اور ماہرین نفسیات کی یہ رائے ہے کہ اس کے استعمال سے نہ صرف صحت برباد ہوتی ہے بلکہ معاشرے میں خوفناک قسم کے نفسیاتی عوارض بھی جنم لیتے ہیں جن سے افراد اور معاشرے سب کو شدید نقصان پہنچتا ہے۔ ہمارے اس ملک میں اب جبکہ شراب کی مخالفت کا موضوع زیر بحث ہے تو بعض چوٹی کے ڈاکٹروں نے بڑے واضح دلائل کے ساتھ اس ام النجاست کے نقصانات کا تذکرہ کیا ہے اور اس باطل خیال کی تردید کی ہے کہ یہ صحت کے لیے کسی اعتبار سے بھی مفید ہو سکتی ہے۔

غیر مسلموں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی تعلیمات کے بارے میں جو متعدد کتب اور مضامین لکھے ہیں ان میں اس امر کا برملا اعتراف کیا گیا ہے کہ حضور نے انسانی معاشرے میں ان بُرائیوں کو مٹانے کے معاملے میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی ہے عرب جیسی شراب کی رسیا قوم میں اس لعنت کا یکسر خاتمہ اسلام کے سجزات میں سے ایک زندہ معجزہ تصور کیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں یوں تو بہت سی تحریریں پیش کی جا سکتی ہیں مگر ہم یہاں اسلام کے چند جانے پہچانے دشمنوں کی آراء نقل کرتے ہیں۔

سر ولیم میور کی اسلام دشمنی آخر کس سے پوشیدہ ہے؟ وہ اپنی کتاب "لائت آف محمد صلی اللہ علیہ وسلم" میں لکھتا ہے:

"اسلام اتنا شراب کے معاملے میں جس قدر بھی فخر کرے وہ حق بجانب ہے کیونکہ کوئی دوسرا

مذہب اس میدان میں اس کا سہم نہیں ہو سکتا" (صفحہ ۱۵۲)

مشہور پادری ٹیلر نے چند برس پیشتر اپنی ایک مذہبی تقریب میں اسلام کی اس عظمت کا کھلے بندوں اس طرح

اعتراف کیا:

”علاوہ اور باتوں کے اسلام پوری دنیا میں اتنا عِ شَراب کی ایک عالمگیر تحریک ہے۔ اس کے مقابلے میں یورپین تجارت کے فروغ پانے سے شراب نوشی، اخلاقی عیوب اور انسانیت کی تذلیل کا سامان فراہم ہوتا ہے“

ڈاکٹر مارگو لیتھ جیسا عدو اسلام اخلاقی میدان میں دینِ حق کی کامیابیوں کا ذکر کرتے ہوئے جب قمار بازی کا تذکرہ کرتا ہے تو وہ یہ تسلیم کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے کہ حضور سرورِ دو عالم نے اس بُرائی سے معاشرے کو جس طرح پاک کیا وہ حضور کی اصلاحات میں سب سے نمایاں اصلاح کہلانے کی مستحق ہے۔

یہ بات ہمارے لیے کس قدر باعثِ شرم ہے کہ جن اخلاقی عیوب کے خاتمہ کی وجہ سے پوری انسانیت ہماری ممنونِ احسان ہو اور ہمارے جن امتیازی اوصاف کے ہمارے کٹر سے کٹر دشمن بھی معترف ہوں ان کے بارے میں ہم تہذیب کی پالیسی اختیار کریں اور پوری قوت سے نہ تو ان بُرائیوں کو مٹانے کا عزم کریں اور نہ ان اوصاف سے منتصف ہونے کے لیے جدوجہد کا کوئی لائحہ عمل تیار کریں۔ بات اگرچہ بڑی سخت ہے لیکن فی الحقیقت ہمارے لیے یہ ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ بھارت اور نام نہاد بنگلہ دیش جن کے دساتیر کی اساس لادینیت پر رکھی گئی ہے ان کے اندر تو شراب پر پابندی عائد کی جائے اور ہمارے اسلامی ملک کے عبوری سوڈے میں صرف ”حوصلہ شکنی“ کے الفاظ درج کر کے عوام کا منہ چڑایا جائے۔

پھر ان بُرائیوں کی ”حوصلہ شکنی“ کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ حوصلہ شکنی کے اس دائرے کو نچلے طبقوں اور جھونپڑوں کے اندر رہنے والوں تک محدود رکھا گیا ہے۔ باقی رہے وہ لوگ جو ”تہذیب و تمدن“ کے جدید ساز و سامان کے ساتھ ان بُرائیوں کے ارتکاب کے ڈھنگ جانتے ہیں وہ ”حوصلہ شکنی“ کی زد سے کبیر باہر ہیں مثلاً جوئے کی تو ”حوصلہ شکنی“ کی جائے گی لیکن اگر ”جو“ ”رہیں“ کی صورت میں کھیل جائے تو اسے سنوڈ کے اندر حوصلہ شکنی کی دستبرد سے پورا تحفظ حاصل ہوگا۔

دینی نقطہ نظر سے اس عبوری آئین کا ایک افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اس میں مسلمان کی تعریف پیش نہیں کی گئی دراصل ایک نظر پاتی مملکت کے دستور کی حیثیت سے اس میں اس تعریف کا اندراج اتہائی ضروری تھا۔ جس ”خانہ ساز نبوت“ کے وابستگان کی ناراضگی کے پیش نظر اس اہم معاملے کو جان بوجھ کر نظر انداز کیا گیا ہے اُسے سب لوگ جانتے ہیں معقولیت کا تقاضا تو یہ تھا کہ پورے ایوان کے سامنے اس بات کو تسلیم کر لیا جاتا

کہ اصحاب اقتدار کسی صورت میں ربوہ کی خلافت کو ناراض کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ مگر اس معقول طرز عمل کو اختیار کرنے کے بجائے منیر رپورٹ کی آڑ لیکر یہ کہا گیا کہ چونکہ علماء کرام مسلمان کی کوئی ایک تعریف متعین کرنے پر متفق نہیں ہو سکے اس لیے ہم بھی دستور میں کوئی تعریف درج کرنے سے قاصر ہیں جسٹس منیر صاحب کا یہ اعتراض کہاں تک صحیح ہے اور انہوں نے یہ اور اسی نوعیت کے دوسرے اعتراضات جن مقاصد کے پیش نظر اٹھائے تھے وہ اب کوئی ڈھکی چھپی باتیں نہیں رہیں پھر علماء نے ان سارے اعتراضات کے جس طرح مسکت جوابات دیئے وہ بھی سب کے سامنے ہیں۔ ان سارے حقائق کو جانتے ہوئے منیر رپورٹ کا سہارا لے کر اس اہم معاملے سے اغماض برتنا تجاہل عارفانہ نہیں بلکہ مجرمانہ تغافل ہے۔

جہاں تک اس دستور کے جمہوری مزاج کا تعلق ہے اُسے بھی کسی اعتبار سے پسندیدہ نہیں کہا جاسکتا جو لوگ اس ملک کی دستوری جدوجہد سے کچھ بھی واقفیت رکھتے ہیں وہ اس حقیقت کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ ۱۹۴۸ء سے قوم بیک زبان ہو کر مطالبہ کرتی رہی ہے کہ ملک میں پارلیمانی نظام رائج ہونا چاہیے۔ کیونکہ اس نظام کے تحت ہی ملک کے مختلف حصوں میں عدل و انصاف قائم ہو سکتا ہے۔ اسی بنیاد پر ۱۹۷۰ء کے انتخابات ہوئے۔ خود پیپلز پارٹی نے عوام سے اس نظام کے نفاذ کا وعدہ کیا اور اس کے صدر اور دوسرے زعماء اپنے اس وعدے کو بار بار دہراتے رہے۔ لیکن اب جبکہ ایوان میں اس وعدے کے ایفاء کا وقت آیا تو حکمران پارٹی نے بڑا افسوسناک طرز عمل اختیار کیا یعنی صوبوں میں تو پارلیمانی نظام حکومت کو تسلیم کیا گیا ہے مگر مرکز میں سدرتی نظام کے حق میں راستے دی گئی ہے۔ مرکزی وزیر قانون خود اس ملک کے ایک نامور ماہر قانون ہیں ان کے لیے یہ بات سمجھنا کچھ مشکل نہیں کہ نظام حکومت کی یہ دوزگی ملک میں کس قسم کی آئینی اور انتظامی پیچیدگیاں پیدا کرے گی؟ خصوصاً ایسے حالات میں جبکہ صدر کو غیر محدود اختیارات بھی حاصل ہونگے اور اس کے انتخاب میں عوام کا براہ راست عمل دخل بھی نہ ہوگا۔ بلکہ صرف قومی اسمبلی کے ارکان انہیں منتخب کرنے کے مجاز ہوں گے۔ یہ سب تدابیر اس حقیقت کی آئینہ دار ہیں کہ صدارت کے پردے میں ملک کے اندر آمریت قائم کی جا رہی ہے۔

کسی ملک میں جمہوریت کے قیام کی پہلی شرط یہ ہوتی ہے کہ عوام براہ راست اپنے حکمرانوں کا انتخاب